مظلومِ کربلا

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ

سید الانبیاء و المرسلین و آلہ الطاہرین۔

کون ہے جس نے محرم میں حسینؑ حسینؑ کی آواز نہ سنی ہوگی۔

اکثر آپ نے اس آواز کے ساتھ کچھ لوگوں کو سر برہنہ نوحہ پڑھتے اور ماتم کرتے بھی دیکھا ہوگا اور شاید آپ نے رونے کی صدائیں بھی سنی ہوں۔

انسانی ہمدردی کی بنا پر ضرور آپ کے دل میں ہمدردی کا احساس پیدا ہوا ہوگا اور آپ نے خیال کیا ہوگا کہ یہ حسینؑ کون تھے جن پر آج تک اس طرح ماتم ہوتا ہے۔ تھوڑا وقت مجھے عاریت دے کر اس مختصر کتاب کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حسینؑ کون تھے ان کا مقصد کیا تھا اور اس مقصد کے سلسلہ میں انھوں نے کیا راستہ اختیار کیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا۔

نسبی خصوصیات

ملک عرب میں مکہ کی سرزمین پر بنی ہاشم کا خاندان ایک ممتاز درجہ رکھتا تھا اس خاندان میں عبدالمطلب سب سے بڑے سردار تھے ان کے دو بیٹے تھے: عبداللہ اور ابوطالب۔ عبداللہ کے فرزند حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جو مذہب اسلام کے بانی اور مسلمانوں کے پیغمبر ہیں اور ابوطالبؑ کے فرزند علیؑ تھے جو حضرت محمدؐ کے بڑے مددگار اور جاں نثار تھے جو متفقہ طور پر رسول کے بعد مسلمانوں کے ایک پیشوا اور رسولؐ کے ایک جانشین تھے۔ حضرت محمدؐ کے ایک بیٹی تھی فاطمہ زہراؑ جن کی وہ بڑی عزت کرتے تھے۔ اس بیٹی کا عقد حضرت محمدؐ نے علیؑ کے ساتھ کیا تھا جنھیں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سب سے زیادہ چاہتے تھے اور فاطمہؑ سے دو بیٹے پیدا ہوئے بڑے کا نام حسنؑ تھا جو علیؑ کے بعد ان کے جانشین ہوئے اور چھوٹے کا نام حسینؑ تھا جن کا نام آپ آج تک سنا کرتے ہیں۔

پیدائش

حضرت محمد مصطفیٰؐ اپنے گھرانے سمیت مکہ کی سرزمین کو چھوڑ کر مدینہ آئے اور یہیں بس گئے۔ ہجرت اسی کا نام ہے۔ اس ہجرت کے تیسرے برس حسینؑ دنیا میں آئے۔ آپ کی پیدائش سے آپ کے نانا رسولؐ اللہ باپ علیؑ مرتضیٰ ماں فاطمہ زہراؑ سب کو بڑی خوشی ہوئی اور خاندان میں یہ ایک قابل شکریہ اضافہ سمجھا گیا۔

بچپنا

حسینؑ نے سات برس تک اپنے نانا رسولؐ اللہ کی پرورش کا لطف حاصل کیا۔ رسولؐ کو اس اپنے چھوٹے نواسے سے بڑی محبت تھی۔ ایسی خوشی اور دل جوئی کے دن پھر حسینؑ کو اپنی تمام عمر نصیب نہیں ہوئے۔

نانا کے بعد

حسینؑ سات برس کے تھے کہ جب ان کے نانا کا انتقال ہوگیا۔ یہ مصیبت تمام خاندان کے لئے ایک بڑی مصیبت تھی۔ حسینؑ نے پہلے دن ہی محسوس کیا کہ وہ، ان کے بھائی اور ان کے ماں باپ اب لوگوں کی نگاہ میں وہ عزت نہیں رکھتے جو اس کے پہلے تھی۔ بہر حال انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے باپ نے

اس بلند مقصد کی خاطر جس کے رسولؐ اللہ حامل تھے اور مسلمانوں میں یک جہتی قائم رکھنے کے لئے تمام ناگوار حالات کو صبر وضبط کے ساتھ برداشت کیا یہاں تک کہ مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھا کر سال کے اندر ہی حسینؑ کی مہربان ماں فاطمہ زہراؑ بھی دنیا سے سدھاریں علیؑ گوشہ نشین ہو گئے اور حسینؑ نے دیکھا کہ بارگاہ کی چہل پہل اب سناٹے سے بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

پچیس برس تک حضرت علیؑ نے خاموشی میں گذارے۔ جب مسلمانوں میں بغاوت پیدا ہوئی اور انہوں نے حاکم وقت کو قتل کر دیا تو وہ علیؑ کے پاس آئے اور کہا: ''اب آپ ہماری رہنمائی کیجئے۔'' حضرت علیؑ نے بہت انکار کیا مگر بہت مجبور کرنے پر حضرت علیؑ نے اس ذمہ داری کو قبول کیا مگر ابھی کچھ ہی زمانہ گذرا تھا کہ آپ کے پرانے دشمنوں نے اور ان کے عزیزوں اور ہواخواہوں نے آپ کے خلاف مخالفت کا طوفان اٹھا دیا اور آپ کو لڑائیوں میں الجھا دیا یہاں تک کہ پانچ ہی برس کی عمر میں آپ کو عین حالت نماز میں مسجد کے اندر قتل کر دیا گیا۔

ان کے بڑے بیٹے امام حسنؑ ان کے جانشین ہوئے مگر حالات ایسے ناسازگار تھے کہ آپ کو ملت اسلامیہ کی حفاظت کے لئے اپنے باپ کے دشمن شام کے باغی حکمراں سے صلح کرنا پڑی اور اس کے بعد بالکل گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کے باوجود حاکم شام کی طرف سے ان کو زہر دے دیا گیا۔

اخلاق و اوصاف

حسینؑ نے اپنے حسن فطرت کے ساتھ ایسی بلند تربیت پائی تھی جو ان کے اخلاق واوصاف کی بلندی کی ضامن تھی پھر ان کو مختلف حالات اور متضاد واقعات کے ایسے دور سے گذرنا پڑا جن میں ان کو جذبات کی طاقت کے خلاف اپنے نفس کی طاقت سے کام لینا پڑا تھا۔ اس لئے ان کے نفس میں پختہ کاری، تدبر اور استقلال پیدا ہو گیا تھا۔ وہ فیاض تھے اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کی فکر رکھتے تھے، وہ عالم تھے ایسے جن سے لوگ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات مین رجوع کرتے تھے، وہ رحم دل تھے ایسے کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھا جاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو فراموش کر کے دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ کیا تم ایسے انسان کے نفس کی بلندی کا اندازہ کر سکتے ہو جس نے اس لشکر کو جو خود اس سے جنگ کے لئے آیا تھا پیاسا دیکھ کر عرب کے بے آب راستوں میں اپنے ساتھ کا تمام پانی پلوا دیا اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کا بلکہ عورتوں اور چھوٹے بچوں تک کا کوئی خیال نہ کیا وہ راست باز اور راست کردار ایسے تھے کہ انھوں نے اپنی جماعت کی تعداد کو قائم کرنے کے لئے کبھی آئندہ خطرات کو پوشیدہ نہیں کیا بلکہ بار بار آئندہ کے خطرات کو یقینی بتا کر ان کو حفاظت جان و مال کے لئے اپنے ساتھ سے چلے جانے کا مشورہ دیا اور یہ طریقہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک کسی ایک شخص کے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا امکان تھا ۔

وہ امن پسند بھی ایسے تھے کہ انھوں نے آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی خود اپنی طرف سے کوشش جاری رکھی مگر اس کے ساتھ عزم و استقلال و ہمت ایسی رکھتے تھے کہ جان دے دی مگر جو پہلے دن راستہ صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا اس سے ایک انچ نہ ہٹے۔

انھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہو کر بھائی کی اطاعت کی، اس طرح کہ ان کی وفادارانہ اطاعت میں کبھی کمزوری نظر نہ آئی، اور پھر بحیثیت حاکم کے کربلا کے واقعہ میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ ان کے نظم قیادت کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ ان کی نگاہ نے مردم شناسی کا وہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا کہ اتنے سخت اور دشوار گذار راستہ کے لئے جن ساتھیوں کو منتخب کر کے انہوں نے اپنے ساتھ لے لیا تھا ان میں سے ایک نے بھی وفاداری اور جاں نثاری میں کمی نہ کی اور سب یک جان و یک دل ہو کر ان کے مقصد کے لئے کوشاں رہے یہاں تک کہ جانیں قربان کر دیں۔ یہ واقعات کچھ ایسے صفات کا پتہ دے رہے ہیں جو حسینؑ

کو دنیائے انسانیت کا ایک معیاری نمونہ ثابت کرتے ہیں۔ حسینؑ میں جاذبیت صرف اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ بے گناہ قتل ہو گئے اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہر انسان کی فطرت ہے بلکہ ان کے اوصاف و کمالات جو ان کے واقعات سے ظاہر ہیں ان کی جانب تمام انسانی برادری کے دلوں کو موڑتے ہیں اور ہر باخبر اور کشادہ دل انسان اس پر مجبور ہے کہ وہ حسینؑ کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور عظمت کا اعتراف کرے۔

قوت برداشت

ناظرین آئندہ کے واقعات میں غلط نتائج تک پہنچ سکتے ہیں اگر وہ حسینؑ کی افتادطبع اور سابقہ زندگی میں ان کی قوت برداشت کا اندازہ نہ کر لیں آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ حسینؑ کو سات برس ہی کی عمر میں ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا جن میں ان کے والد بزرگوار حضرت علیؑ کے مقابلہ میں دوسرے افراد نے اقتدار قائم کر لیا تھا اور حضرت علیؑ ایسے شجاع اور طاقتور بہادر نے مفاد اسلامی کی خاطر صبر وضبط سے کام لیا تھا۔ یہ زمانہ پچیس برس تک رہا ظرف مکان کا یہ حصہ وہ ہے جس میں حسینؑ نے کمسنی کے حدود کو ختم کر کے نوجوانی کی منزل کو طئے کیا اور پورے شباب کے درجہ تک پہنچے۔ عمر کا یہ دور وہ ہوتا ہے جس میں ولولہ، امنگ اور حوصلہ انسان سے خلاف تدبر اقدامات کرا دیا کرتا ہے مگر تمام ناگوار حالات کے باوجود حسینؑ نے کوئی فعل ایسا نہیں کیا جو نظم اصول اور اپنے بزرگ مرتبہ باپ کے اختیار کردہ مسلک کے خلاف ہو بلکہ تاریخیں بتلاتی ہیں کہ جب مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ جناب عثمان محاصرہ میں تھے اور ان پر پانی بند کر دیا گیا ہے تو حضرت علیؑ نے حسنؑ اور حسینؑ، اپنے دونوں فرزندوں کو پانی پہنچانے کے لئے بھیجا تھا، وہ باغیوں کی شورش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گئے اور اپنے فرض کو انجام دیا۔ حضرت علیؑ کے دور حکومت میں مخالفوں کی جارحانہ کارروائیوں کے مقابلہ میں حسینؑ شریک رہے مگر جب صفین میں قرآن نیزوں پر بلند کئے گئے اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے اختلاف سے مجبور ہو کر حضرت علیؑ کو جنگ کے ملتوی کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا تو جواں سال حسینؑ نے بلاتوقف سر تسلیم خم کیا اور اپنے بھائی حسنؑ کے ساتھ اس معاہدہ پر دستخط کئے جو التوائے جنگ کے لئے تحریر کیا گیا تھا۔ حضرت علیؑ شہید ہوئے اور ان کی جگہ پر حضرت حسنؑ پیشوا تسلیم کئے گئے اور آپ کو اپنے حریف سے صلح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حسینؑ نے بھی اس مصالحت کی پابندی کی۔ دس برس تک کا زمانہ یوں ہی گذرا اور اس زمانے میں ایسے واقعات پیش آتے رہے جو پیمانہ صبر وضبط کو چھلکا دیں مگر امام حسینؑ نے کوئی اقدام نہیں کیا یہاں تک کہ دنیا کے معاملات سے کنارہ کش گوشہ نشین اور خاموش رہتے ہوئے بھی امام حسنؑ زہر سے شہید کر دئے گئے اور یہ تاریخ کا ایک عبرت ناک واقعہ ہے کہ حضرت حسنؑ کو اپنے نانا کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت نہ دی گئی بلکہ مزاحمت ہوئی یہاں تک کی جنازہ پر تیر چلائے گئے جن میں چند تیر تابوت کو توڑ کے امام حسنؑ کے جسم تک پہنچے مگر بھائی کی وصیت اور حالات کے تقاضے کی بنا پر حضرت حسینؑ خاموش رہے اور اپنے بھائی کو روضۂ رسولؐ سے الگ مقام پر دفن کر دیا۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ حسینؑ کوئی جذباتی انسان نہیں تھے، وہ صابر اور متحمل تھے اور کبھی غصہ اور جوش میں آ کر کوئی ایسا اقدام نہیں کرتے تھے جو نظم وضبط اور سکون کے خلاف ہو سخت سے سخت مواقع پر خاموشی آپ کا ایک مستقل کردار بن گئی تھی، بشرطیکہ اس خاموشی سے ان مقاصد کو کوئی ضرب نہ پہنچے جن کے وہ خود اور ان کے نانا، باپ اور بھائی محافظ رہے تھے۔

واقعۂ کربلا کے اسباب

اب آپ کو اندازہ ہونا چاہئے کہ ایک ایسا صلح کل، متحمل، امن پسند انسان کیسے ایک ایسے اقدام کے لئے تیار ہو سکتا ہے جس میں اس کے تمام ساتھیوں کے تہہ تیغ ہو جانے کا یقین ہو، بغیر غیر معمولی اسباب کے — پھر وہ اسباب کیا تھے؟

اچھا سنئے! یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ حسینؑ حضرت محمد مصطفیؐ کے نواسے تھے اور حضرت محمدؐ اس انقلاب کے مرکز تھے جس کا

نام ہے اسلام، اسلام سے پہلے عرب کی معاشی اور معاشرتی دنیا جس قدر تاریک تھی اس کا آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مساوات انسانی کوئی چیز نہ تھی اور غلبہ طاقت واقتدار سب کچھ تھا اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ تھی ایک بڑے آدمی کے قتل ہوجانے پر صرف اس کے قاتل کو نہ قتل کیا جاتا تھا بلکہ فریق مخالف کے سیکڑوں آدمی مارڈالے جاتے تھے تب سمجھا جاتا تھا کہ خون کا اس کے بدلا ہوا، اس کے خلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوجاتا تھا تو اس کا خون معاف تھا۔

یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گناہوں کی سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرخچے اڑا رہی تھی۔ ان سب کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مادیت کو اپنا معبود سمجھ لیا تھا، ماوراء المادہ کا تخیل نہ باقی رہا تھا، اس لئے مادی طاقت ہی ان سب کے نزدیک سب کچھ تھی۔

اسلام جو ایک عظیم انقلاب کا حامل بن کر آیا تھا اس نے سب سے پہلے اس کا اصلی سبب دور کرتے ہوئے لوگوں کی نگاہ کو مادیت کے احاطے سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے اور پھر اس نے سابق کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات کو مٹا کر نیا امتیاز قائم کیا کہ جو شخص فرائض انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس اصول کے ماتحت غلبہ طاقت اختیار (واقتدار) قوم وقبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں۔ اس نے کہا کہ ہر انسان دوسرے کے برابر ہے جب تک کہ انسانیت کے اوصاف میں اپنے تئیں اس سے بہتر نہ ثابت کرے۔

اس سے معاشی معاشرتی اور تمدنی حالات میں بڑی تبدیلیاں ہوگئیں۔ اسلام نے اس انقلاب کے پیدا کرنے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی، بہت سے بلند خاندان کے افراد کی شادی کی گئی، ان خاندانوں میں جو قدیم زمانہ سے پست سمجھے جاتے تھے۔ ایک بلند مرتبہ شخص کے قاتل کے بدلے یہ امر ناممکن ہوگیا کہ سوائے اس کے کوئی دوسرا شخص قتل کیا جائے۔

بہت سی غیر قوم اور پردیسی انسانوں کو جو اس سے پہلے جانوروں کے برابر سمجھے جاتے تھے ان کے انسانی اوصاف کی بدولت وہ عزت حاصل ہوئی جو بڑے بڑے خاندانی عربوں کو نہ تھی اور اکثر مہموں میں عرب قوم کو سرداری قبول کرنا پڑی ان لوگوں کی جنھیں وہ نسلی حیثیت سے اپنے برابر نہ سمجھتے تھے یا مادی غلبہ اور اختیار کے لحاظ سے جنھیں وہ کمزور خیال کرتے تھے۔

ہر انقلاب کے بالکل متوازی ایک اور انقلاب شروع ہو جاتا ہے جو انقلاب سے پیدا ہونے والے امتیازات کو مٹا دینا چاہتا ہے اور رجعت پسندی اور قدامت پسندی کے امتیازات کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

اسلام کو اس حیثیت سے ان تمام قبائل کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس سے پہلے اپنے تئیں غلبہ واقتدار کا حقدار سمجھتے تھے، خواہ نسلی تفوق کی بنا پر خواہ مال و دولت کی بنا پر، خواہ اپنے قوم وقبیلہ کی بنا پر۔

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سلسلہ میں کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں جن میں بدر، احد اور احزاب بہت مشہور لڑائیاں ہیں ان میں بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بہت آگے آگے تھا اور وہ مخالف جماعت کا سرگروہ تھا۔

ان مقابلوں میں گرچہ کامیابی اسلام کو ہوئی مگر ہر کامیابی مخالف جماعت کے دل میں ایک جذبۂ انتقام پیدا کر دیتی تھی، اس لئے ظاہری قوتوں کے توازن میں اسلام اگرچہ سب سے وزنی طاقت بن گیا مگر اس کے خلاف مخالفت کا جذبہ باطنی طور پر اور سنگین تر ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک وہ وقت آیا جب فریق مخالف کی شکست نے مختتم طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور مخالف جماعت کے لوگ یہاں تک کہ خود ابوسفیان اور اس کے خاندان والے اسلام لے آئے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوموں کے کچھ نفسیات ہوتے ہیں۔ اسلام سے

شکست خوردہ جماعت یعنی بنی امیہ اور ان کے ہواخواہ جب اسلام لے آئے تو ان کی نفسیاتی حیثیت یہ تھی کہ وہ برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہنچا دیں اور اگر اس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم اس کے مقصد کو تبدیل کر کے ان امتیازات کو مٹا دیں جو اسلام نے قائم کئے ہیں اور اس کے پردہ ہی میں سہی مگر ان امتیازات کو قائم کر دیں جو اسلام کے پہلے عرب میں قائم تھے۔

پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں ان کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی مگر پیغمبرؐ کے بعد ان کو اپنے مقاصد کی کامیابی کی کافی توقع تھی۔

پیغمبر اسلامؐ کے بعد اسلامی انقلاب کے محافظ پیغمبرؐ کے ورثہ داران کے گھرانے والے وہ لوگ تھے جنھیں وہ برابر اپنے کاموں میں شریک رکھتے تھے اور جنھوں نے انہیں اپنے مقاصد کو پورے طور سے مطلع کر دیا تھا اور ان کی عملی تربیت اس طرح کر دی تھی کہ وہ اپنے افعال واقوال سے ان مقاصد کے ترجمان اور محافظ بن سکیں۔ ان میں اور اس کے متوازی دوسرے انقلاب کے علمبرداروں میں کش مکش لازمی تھی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دفعہ آزمائش کے وقت آل رسولؐ کے ساتھی کم نکلے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا، اس کے وجوہ اقتصادی بھی ہیں اور سیاسی بھی نفسیاتی بھی اور نسلی بھی۔

آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام قدیم امتیازات کو مٹا کر مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا اور اس نے امتیاز صرف فرائض انسانی کی بنا پر قرار دیا تھا۔ مال ودولت کی اس طرح تقسیم کہ جس میں جانب داری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے، اسلام کے اصول کے خلاف تھی اور اس کے محافظین بھی اس کے قریب نہ جا سکتے تھے، اس لئے کہ آل رسولؐ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ میں روپیہ جمع کر کے دولت مند بنیں اور خصوصیت سے ان لوگوں کو زر وجواہر سے مالا مال کریں جن سے ان کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی امید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علیؑ سے ان کے بھائی عقیل تک برگشتہ ہو گئے اس بنا پر کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کو تمام مسلمانوں سے کچھ زیادہ دیا جائے اور حضرت علیؑ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ پھر جب خاص اپنے بھائی کا یہ عالم تھا تو دوسروں کا کیا ذکر۔

اس کے برخلاف دوسری جماعت کے لوگوں کو اس بات کی پرواہ نہ تھی وہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے لے لئے خزانہ کا منھ کھول دیتے تھے اور جس کو اپنے مطلب کا سمجھتے تھے اس کو مالا مال کر دیتے تھے۔

اس کے علاوہ اسلام نے اُن تمام مقتدر اشخاص اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کر دیا تھا جو اس کے پہلے برسر اقتدار تھیں اور ایک بالکل الگ معیار قائم کیا تھا۔ وہ مقتدر جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبانہ چشمک رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ وہ سب ہی تھیں۔ اس لئے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کو مٹانے میں وہ سب ہم آہنگ بن سکتی تھیں اس لئے کہ اس کو مٹانے میں ان میں سے ہر ایک کے اقتدار کا قیام منحصر تھا پھر یہ بھی ہے کہ سابق کی شکستوں کا ان سب ہی کے دل پر اثر تھا اور سب ہی میں جذبۂ انتقام پایا جاتا تھا اور پھر اتفاق کی بات یہ ہے کہ رسولؐ کے مسلک کے تمام محافظ ایک خاص خاندان (بنو ہاشم) کے لوگ تھے جن سے اکثر عرب خاندانوں کو پہلے سے حسد اور عناد تھا۔ اس لئے وہ نسلی تعصّبات بھی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے اور چونکہ عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا۔ ہر قبیلہ کے سرگروہ اور بڑے افراد ان جذبات کی بنا پر جو ابھی بیان ہوئے تھے جس راستے پر جاتے تھے عوام اور پست افراد اہل قبیلہ ان ہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا، نہ ان کی کوئی رائے، خصوصاً جبکہ جہالت بھی ان میں اس حد تک تھی کہ جو ان ہی کے ساتھ مخصوص تھی۔

بنو امیہ کا اقتدار مسلمانوں میں بحیثیت ایک صوبہ دار حاکم کے شروع ہوا۔ ملک شام میں معاویہ کا گورنر مقرر کیا جانا اس کا آغاز تھا۔ انہوں نے اپنے دور حکومت کی ابتدا ہی سے اپنی سیاسی روش ملوکانہ شان وشوکت کی حامل رکھی۔

مسلمانوں کو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس پر انتباہ ہوا تو ایک چالاک اور شاطر سیاست داں کی طرح یہ کہہ کر تسکین کر دی گئی: چونکہ شام کی سرحد قیصر روم کے ملک سے ملی ہوئی ہے، اس لئے یہاں اسلام کی عظمت کو قائم رکھنے کے لئے اس طرح کے جاہ و جبروت کی ضرورت ہے۔

سمجھنے والے سمجھے کہ اس طرح درحقیقت اسلام کے اس قدر و قیمت اور معیار کو مٹانا ہے جو اس نے بڑی کوشش سے دنیوی جاہ وشوکت کی قدر و قیمت کو مٹا کر قائم کیا تھا۔ اس میں ترقی اس وقت پوری طرح ہوگئی جب اسلام کا اقتدار اعلیٰ بھی بحیثیت خلیفہ بنوامیہ کی ایک بزرگ شخصیت کو حاصل ہو گیا۔ اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے پورے طور پر اس وقت بنوامیہ کو قوت حاصل ہوئی اور وہ امتیازات بالکل نظر انداز ہونے لگے جو اسلام کے سادہ اور غربا پرور اصول نے قائم کئے تھے۔ اس کا ادنیٰ نمونہ تھا ابوذر غفاریؓ کو جلاوطن کیا جانا۔ عمار یاسرؓ اور ابن مسعودؓ کو زدوکوب کیا جانا۔ مخفی نہ رہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو اسلام کے قائم کردہ حدود وامتیازات میں بڑی عظمت کے مستحق تھے مگر موجودہ طاقت و اقتدار کے حدود میں وہ بالکل کم حقیقت اور بے وقعت ہو گئے تھے۔ اس کے معنیٰ یہ تھے کہ اسلامی انقلاب کی جگہ قدامت پرستانہ انقلاب فتح پانے لگا اور اسلام کے مقررہ حدود کے بجائے دوسرے حدود و امتیازات قائم ہو گئے۔

حضرت علیؑ کی خلافت کا مختصر دور تمام تر اسی اموی اقتدار کے مقابلہ میں صرف ہوا جس میں حضرت علیؑ کو بہت محدود کامیابی حاصل ہو سکی۔

حضرت علیؑ کی زندگی ختم ہونے کے ساتھ اس اقتدار میں اور اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ حضرت امام حسنؑ کو صلح پر مجبور ہونا پڑا اور اس طرح آپ نے مخالف طاقت کے جارحانہ اعمال کو شرائط صلح کے ذریعہ سے محدود بنانے کی کوشش کی مگر حضرت امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا اور شرائط صلح کی خلاف ورزی کی جانے لگی اور سیاسی اقتدار کی جرأت و بے باکی اس حد پر پہنچی کہ حجر ابن عدی اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو جو بڑے عابد و زاہد متقی و پارسا تھے تہہ تیغ کر دیا گیا اور عمر ابن الحمق الخزاعی کا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بڑا درجہ رکھتے تھے سر قلم کر کے نیزے پر بلند کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلام کا نظریۂ روحانیت وللّٰہیت فنا ہونے لگا اور مسلمانوں میں بھی ''طاقت حق ہے'' کا عملی طور پر کلمہ پڑھا جانے لگا۔ حق پرستی ختم ہوئی، آزادئ ضمیر رخصت ہوئی، ایمان اور اعتقاد رُوپہلے اور سنہرے سکوں پر بیچا جانے لگا اور مادی اقتدار کے طاغوت کی پرستش ہونے لگی۔

یہ حالات پھر بھی برداشت کئے جانے کے قابل تھے اگر معاویہ کی جانب سے اس شرط کی مخالفت نہ ہوتی کہ ان کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

امام حسنؑ نے بڑی عاقبت اندیشی اور انجام بینی سے یہ شرط قرار دی تھی مگر اموی سیاست اپنے مقاصد کے لحاظ سے نامکمل اور ناکام رہتی اگر اس شرط پر عمل کر لیا جاتا، اس لئے معاویہ نے اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا اور صرف نامزد ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی سے بڑی کوشش کے ساتھ یزید کی بیعت حاصل کی گئی۔

یزید کے افعال واعمال اگر وہ نہ بھی ہوتے جن کو اس کے بعد مختصر طور سے بیان کیا جائے گا تب بھی اس کو ولی عہد بنانا شرائط صلح نامہ کی بنا پر ناجائز تھا مگر مسلمانوں میں اقتدار وطاقت سے مرعوبیت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ کسی کو اس پر توجہ نہ ہوئی اور توجہ ہوتی بھی تو اظہار کی جرأت نہ تھی۔

آل رسولؐ میں اس وقت بزرگ ہستی امام حسینؑ کی تھی۔ آپ بنی امیہ کے طرز عمل کو مدت سے محسوس کر رہے تھے کہ وہ کس طرح سے اسلام کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہے اور کس طرح دنیا کو رجعت پسندی اور قدامت پسندی کی طرف لے جا رہا ہے؟ پھر بھی وہ اس سے متوقع تھے کہ شائد یہ صورت حال معاویہ کی زندگی کے اختتام کے بعد ختم ہو جائے گی مگر یہ اس انقلابی سیاست کی آخری چال تھی کہ شاہان خودمختار کی طرح اپنے

بعد کے لئے اپنے بیٹے کو بغیر اس کے اوصاف کا لحاظ کئے ہوئے نامزد بنادیا۔ آپ نے اس کو شدت سے محسوس کیا اور اندازہ کیا کہ آپ پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔

معاویہ بھی سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ متعلق انسان امام حسینؑ ہیں اس لئے انھوں نے آپ کو ملانے کی پوری کوشش کی مگر نتیجہ میں ناکام ہونا پڑا۔ یہ بنی امیہ کے اقتدار کو بڑی کاری ضرب تھی جسے معاویہ کی قوت فراست سمجھ چکی تھی۔ اسے حسینؑ ابن علیؑ کا ایک بڑا تدبر سمجھنا چاہئے کہ آپ نے اپنے عمل کو سکوت اور بے تعلقی تک محدود رکھا۔ آپ جانتے تھے کہ فریق مخالف اس سکوت کو توڑنے میں انتہائی تشدد سے کام لے گا جس کے لئے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام یا بغاوت یا شورش کا اقدام عائد کیا جاسکے۔

معاویہ بڑے جہاں دیدہ انسان تھے۔ وہ حسینؑ کے اس سکوت کو اپنے اقتدار کی شکست کا مرادف سمجھ کر بے چین تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ اگر ہم سختی کریں گے تو وہ اس شکست کی انتہائی تکمیل ہوگی۔ اس لئے حسینؑ چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ ہم تشدد سے علاحدہ رہیں اور حسینؑ کی خاموشی قائم نہ رہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ کربلا کی جنگ یہیں سے شروع ہوتی ہے مگر یہ ایک صبر آزما اور روحانی کشمکش تھی جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی اگر معاویہ کا رشتۂ عمر ختم نہ ہوتا اور نوعمر، ناتجربہ کار، غرور سلطنت سے بدمست یزید تخت سلطنت پر نہ بیٹھتا۔

حسینؑ کی بیعت سے علاحدگی اور خاموشی معاویہ کو اتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو، مگر معاویہ کو تشدد کے نتیجہ کا اندازہ تھا اور یزید کو نہ تھا۔ یزید نے حسینؑ کی خاموشی کو طاقت واقتدار سے توڑنا چاہا اور بجبر آپ سے بیعت لینے کی خواہش کی۔

ولید ابن عقبہ جو مدینہ میں اس کا گورنر تھا اسے وفات معاویہ کی اطلاع کے ساتھ ہی یہ پیغام بھیجا کہ جلد سے جلد حسینؑ ابن علیؑ سے میری بیعت لو اور اگر بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کر کے بھیج دو۔ یہ تھا وہ پہلا قدم تشدد کا، جو یزید کی طرف سے اٹھایا گیا اور اگر ولید اس حکم کی پوری تعمیل کرنا چاہتا تو مدینہ ہی کربلا بن جاتا۔ امامؑ کے سامنے اس مطالبہ کا اس طرح پیش ہونا گویا حسینی تدبر کی پہلی فتح اور اموی سیاست کی ابتدائی شکست تھی۔ اس نے سمجھا تھا کہ حسینؑ کی بیعت سے علاحدگی ایک وقتی بات ہے جو اس دھمکی سے فوراً قبول بیعت سے تبدیل ہوجائے گی اور حسینؑ نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ سوچ سمجھ کر اس کے تمام آخری نتائج کا اندازہ کرلینے کے بعد اختیار کیا تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی مقاصد، حدود وامتیازات میں کس طرح تبدیلی ہوگئی ہے مگر اس پر ابھی تک ظاہری اسلام کا پردہ پڑا ہوا ہے، اس لئے عام اشخاص اس کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے۔ حسینؑ چاہتے تھے کہ فریق مخالف کو تشدد کے آخری درجہ پر پہنچا کر اس کے غیر انسانی جذبات کو اس طرح نمایاں ہونے کا موقع دیں کہ عوام کو اس کا قوی احساس پیدا ہوجائے اور آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں۔

امام حسینؑ کے لئے اپنے مقاصد کے حصول کا سوائے اس کے کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ اپنی جان بچالیتے مگر جان کو بہرحال بچانا ہوتا تو وہ شروع ہی سے بیعت کا انکار نہ کرتے۔ جان کا بچانا انھیں مدنظر تھا اس حد تک کہ ان کے اصول اور مقصد کا بھی تحفظ ہو، لیکن اگر مقصد کا تحفظ جان دینے پر ہی موقوف ہو پھر ان کے نزدیک جان کا دے دینا آسان امر تھا۔

مقصد کے تحفظ کے لئے صرف دو طریقہ ہوسکتے ہیں: ایک فریق مخالف سے مل کر شرائط صلح کے ذریعہ سے، دوسرے جنگ کر کے فتح وغلبہ حاصل کر کے۔ یہ دونوں طریقے امامؑ کے لئے ناممکن تھے۔ صلح کی منزل کو امام حسنؑ طے کر چکے تھے اور شرایط صلح کی مخالفت ہی اب وہ صورت حال تھی جو امام حسینؑ کے سامنے تھی۔ حالانکہ معاویہ اپنے کردار کے ذریعہ سے بہ نسبت یزید کے کہیں اونچا درجہ رکھتے تھے پھر جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام ہوئی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنیٰ؟ جب کہ یزید کے افعال وہ تھے جو کھلم کھلا اسلامی اصول وقوانین کے

ساتھ جنگ رکھتے تھے، یہاں اسلام کے ظاہری رسوم نماز، روزہ وغیرہ کا بھی پتہ نہ تھا اور نکاح وازدواج کے اصول وقوانین کی بھی مراعات نہ تھی اور اسلام کے منہیات مثلاً شراب وغیرہ کا ظاہر بظاہر ارتکاب تھا اور اس کے ساتھ اسلامی خلافت کا دعویٰ تھا۔ موجودہ حالت میں اگر حسینؑ بھی جو کہ اسلامی تمدن کے محافظ تھے یزید کی بیعت کر لیتے اور مصلحت سے کام لیتے تو یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کا تمدن وتہذیب اور اصول معاشرت مستقل طور پر یہی بن جاتا کہ جس طرف بنی امیہ کی سیاست لئے جارہی تھی اور جس کا یزید اپنے وقت میں بہترین نمونہ تھا۔

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ حسینؑ کے واقعۂ شہادت کے بعد بھی تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوئے جن کا یزید ارتکاب کرتا تھا مگر یاد رکھنا چاہئے کہ حسینی مقاومت نے اسلام کے تمدن واصول کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے ہیں وہ بالکل انفرادی اور شخصی جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا کوئی ذہنی اثر افراد جامعہ پر نہیں پڑتا یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا ہے کہ اسی کو اسلام کا مستقل اصول اور طریق معاشرت سمجھ لیا جائے کیوں کہ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے کربلا میں اسلام کے حقیقی اخلاق کا نہ مٹنے والا نمونہ پیش کر دیا اور اس کی آئینی اہمیت کو انتہا درجہ واضح کر دیا ہے اب اگر اسلام کے دامن پر دھبہ لگانے کے لئے سلاطین بنی امیہ و بنی عباس کی مثال پیش کی جائے تو فوراً اسلام کی جانب سے صفائی پیش کرنے کے لئے حسینؑ کا اقدام تاریخ کے صفحات پر سامنے آجاتا ہے۔

یزید اور امام حسینؑ کے مقاصد بالکل مختلف اور متضاد تھے۔ وہ جاہلیت کے مادی دور کے پلٹانے کا علمبردار اور حسینؑ روحانیت اور انسانیت کو قائم کرنے کے ذمہ دار، وہ طاقت اور اقتدار کا سکہ چلانے کا درپے اور حسینؑ حق وراستی کا علم بلند کرنے پر آمادہ، وہ اسلامی حدود وامتیازات کو مٹانے پر تلا ہوا اور حسینؑ اسلامی امتیازات کو باقی رکھنے پر کمربستہ۔

پھر بھلا بتلایئے کہ امام حسینؑ اور یزید میں صلح کیوں کر ہو سکتی تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ آپ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے اور فتح وغلبہ حاصل کر کے یزید کو شکست دیتے مگر آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ طاقت کے مقابلہ میں آل رسولؐ کے ساتھی ہمیشہ کم نکلتے تھے۔ اس طرح کا تجربہ پورے طور پر حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے وقت میں ہو چکا تھا۔

پھر دنیا کی ذہنیت اتنی ماؤف ہو چکی تھی کہ اگر آپ فوج و لشکر جمع کر کے جنگ بھی کرتے تو جو اس کی واقعی حیثیت تھی اس کے سمجھنے والے بہت کم اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ یہ حکومت وسلطنت کی غرض سے دو بادشاہوں کی جنگ ہے اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پلہ گراں رہتا، اس لئے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور حسینؑ کا پلہ سبک رہتا اس بنا پر کہ وہ ایک باغی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر اس صورت میں آپ کو فتح حاصل بھی ہوتی، جو بظاہر ناممکن تھی تو اس کا اثر ایک وقتی انقلاب کی صورت سے ہوتا جس کا اثر دیرپا نہیں رہتا اور بنی امیہ پر جو ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اب بھی اسی طرح پڑا رہتا جیسے اس کے پہلے تھا اور اگر کچھ لوگ حسینؑ کو حق پر سمجھتے بھی ہوتے تو فریق محارب کو خطاء اجتہادی کا سارٹیفکٹ دے دیتے جیسا کہ اس سے پہلے صفین کی جنگ میں ہوا۔ اس صورت میں بنی امیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو ان سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک ان سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اس وقت تک ان امتیازات وحدود کی مکمل شکست نہیں ہو سکتی تھی جسے بنی امیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

معلوم ہوا کہ صلح بھی ناممکن تھی اور جنگ بھی، پھر اب تیسرا راستہ کون سا تھا؟ وہی جسے حسینؑ نے اختیار کیا اور اگر حسینؑ اختیار نہ کرتے تو اس کا تصور بھی ہمارے لئے دشوار ہوتا۔

آپ نے اقتدار کا مقابلہ بےبسی سے، کثرت کا مقابلہ وحدت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے ساتھ کیا اور یہ وہ طریقۂ جنگ تھا جس کا مقابلہ اس کے پہلے دنیا نے نہیں کیا تھا۔ آپ کی نظر میں

شکست و فتح کا مفہوم بالکل جدا گانہ تھا۔ فتح کے معنیٰ یہ نہ تھے کہ آپ دشمن کی فوجوں کو پامال کر کے اس کے ملک پر قبضہ کر لیں اور شکست کے معنی یہ نہ تھے کہ آپ کے ساتھ والے سب ختم ہو جائیں اور آپ بھی ختم ہو جائیں۔

آپ کے نزدیک فتح کے یہ معنیٰ تھے کہ کہاں تک آپ اپنے اصول کی حمایت میں مصائب کا زیادہ مقابلہ کرتے ہیں اور کہاں تک آپ کا دشمن اپنے مقاصد کے تحفظ میں تشدد سے کام لیتا ہے۔ دشمن کے تشدد کا ہر قدم ایک مورچہ تھا جسے حسینؑ فتح کرتے تھے اور اس کا انتہائی مشددانہ انجام حسینؑ کے اپنے مقاصد کے لحاظ سے ایک مکمل فتح تھی۔

اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسینؑ نے اپنے ساتھ بڑا سامان کیا تھا، طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا ہوتا تو فوج ولشکر کی تعداد میں اضافہ کرتے، انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ تعداد کو توحتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ مختصر بنایا مگر انھوں نے اپنے ساتھ ایسے ایسے عابد وزاہد ومتقی و پارسا لوگوں کو لیا جن کی نیکی اور پاک دامنی اور زہد وتقویٰ کا سارے ملک میں کلمہ پڑھا جاتا تھا، انہوں نے ایسے بوڑھے اپنے ساتھ لئے جن کی بھویں لٹک کر آنکھوں تک آ گئی تھیں اور انہوں نے ایسے جوان اپنے ساتھ لئے جن کے شباب اور حسن و جمال کا نظیر نہ تھا، کچھ ایسے بچے بھی ساتھ لئے جن کے ہاتھوں میں تلوار اٹھانے کی طاقت نہ تھی بلکہ گہوارے میں لیٹے ہوئے شیر خوار بچے تک کو ساتھ لیا اور پردہ نشین عورتوں کو جو رسولؐ اللہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور جن میں رسولؐ کی حقیقی نواسیاں بھی موجود تھیں اپنے ساتھ لیا۔

تم اس ساز و سامان سے سمجھ سکتے ہو کہ حسینؑ کا مقصد کیا تھا اور وہ کس طرح اپنے مخالف سے جنگ کرنا چاہتے تھے یاد رکھو کہ حسینؑ کے ساتھ یہ وہ مشین گنیں تھیں جن کو حسینؑ بنی امیہ کے قصرِ استبداد کے تباہ کرنے کا انتہائی طاقتور ذریعہ سمجھتے تھے اور بیشک ان کا خیال صحیح تھا۔ امام حسینؑ کے لئے بہتریں اور مفید ترین راستہ یہی تھا اور اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہ تھا۔

مدینہ سے روانگی

امام حسینؑ نے بیعت کے مطالبے کو سن کر پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مدینہ کو چھوڑ دیا اس میں امن پسندی کے ثبوت کے علاوہ اپنے مقاصد کی اشاعت کا پہلو بھی مضمر تھا اگر آپ مدینہ میں شہید ہو جاتے تو مخالف کی طرف سے اس کی بہت سی تاویلیں کر دی جاتی اور جس طرح امام حسنؑ کا قتل آج تک عوام کی نگاہ میں مشتبہ ہے اسی طرح امام حسینؑ کی شہادت بھی مخفی رہتی اور قربانی کا وہ مقصد حاصل نہ ہوتا جو امامؑ کے پیش نظر تھا۔

مکہ میں پناہ

آپ نے مدینے سے نکل کر حرم خدا میں پناہ لی۔ بظاہر تو یہ صرف خود اختیاری کا ایک طریقہ تھا مگر اس میں بہت بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ مکہ معظّمہ تمام ممالک عربیہ کا مرجع و ماویٰ تھا اور ہر سمت کے لوگ مکہ میں مجتمع تھے امام کا مکہ میں قیام لوگوں کو اس سوال پر مجبور کرتا تھا کہ کن اسباب کی بنا پر فرزند رسولؐ نے نانا کے جوار کو ترک کیا ہے۔

اس صورت سے آپ کے یزید کے ساتھ خاموش اختلاف اور اس کے وجوہ کا اعلان تمام ملک میں ہو گیا اور ان غلط فہمیوں کا سد باب ہو گیا جو اس سلسلہ میں پھیلائی جا سکتی تھیں۔

مکہ سے روانگی

آپ کی مکہ سے روانگی بالکل غیر متوقع حالات میں تھی۔ ایک ایسے موقع پر جب کہ حج کو صرف دو روز باقی تھے اور دور دور کے لوگ سمٹ سمٹ کے مکہ میں جمع ہو رہے تھے، ایسے موقع پر آپ کا حج کو ترک کر کے مکہ کو روانہ ہو جانا غیر معمولی ہی حالات کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ آپ کو اندیشہ تھا کہ آپ کی موجودگی مکہ معظّمہ کی سرزمین پر خونریزی کا باعث نہ ہو آپ نے حرم خدا کی عزت پر اپنی سکون کی زندگی کو قربان کر دیا۔

کیا آپ کی اس غیر متوقع طور پر روانگی مکہ معظّمہ کے بین القبائلی اجتماع میں شدید احساس وتوجہ پیدا کرنے کا باعث نہ ہوئی ہوگی۔

اس موقع پر جب کہ ذرائع خبر رسانی کے مفقود تھے، امامؑ نے اپنے اس طرزِ عمل سے دنیائے اسلام کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے وہ اسباب مہیّا کئے جن سے بڑھ کر کوئی ذریعہ ممکن نہ تھا۔

کربلا میں ورود

امام حسینؑ کو اہل کوفہ رہنمائی کے واسطے مدت سے بلا رہے تھے۔ جب کہ آپ کا مکہ سے نکلنا ناگزیز ہو گیا تو کوفہ کی طرف متوجہ ہوئے، آپ اپنے چچازاد بھائی مسلمؑ بن عقیلؑ کو وہاں کے حالات کے مطالعہ کے لئے بھیج بھی چکے تھے اور انھوں نے بھی لکھ دیا تھا کہ یہاں کے لوگ آپ کے ساتھ وفاداری پر تیار ہیں۔

ان حالات کی بنا پر آپ کوفہ کی جانب متوجہ ہوئے مگر اس عرصہ میں وہاں کی فضا میں انقلاب ہو چکا تھا اور یزید کی جانب سے ابن زیاد کی حکومت قائم ہو گئی تھی جس نے کوفہ کے گرد افواج کا آہنی حصار قائم کر دیا تھا۔ امام بھی راستے ہی میں تھے کہ کوفہ کی فوج آ کر سدراہ ہو گئی اور آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روکا۔ مجبوراً آپ کربلا کی زمین پر اتر پڑے۔ یہ وہی زمین ہے جو اس عظیم الشان قربانی کا مرکز قرار پائی جو واقعۂ کربلا کے نام سے آج دنیا میں مشہور ہے۔

کربلا پہنچنے کے بعد

ابن زیاد کو علم ہوا کہ حسینؑ کربلا پہنچ گئے ہیں، اس نے فوجیں بھیجنا شروع کیں اور اس قدر فوجیں کہ وسیع جنگل آدمیوں کی کثرت سے لبریز نظر آنے لگا۔ سمجھ لیجئے کہ کوفہ کی تمام جنگ کے قابل آبادی کربلا کی سرزمین پر امنڈ آئی تھی۔ عمر سعد اس فوج کا افسر تھا۔

امن و امان کی کوشش اور اس میں ناکامی

امام حسینؑ نے کوشش کی کہ کسی طرح خونریزی کی نوبت نہ آنے پائے اور امن و امان کو صدمہ نہ پہنچے، اس غرض سے آپ نے عمر سعد کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کیا اور بات اتنے پر ختم ہوئی جاتی تھی کہ آپ عراق میں قیام کے خیال کو ترک کر دیں گے اور اگر ضرورت ہو تو عرب کا ملک بھی چھوڑ دیں گے اور کسی دور دراز جگہ پر چلے جائیں گے۔

غور کیجئے تو اس صورت سے بھی حسینؑ کی فتح تھی یعنی آپ کا ملک کو ترک کرنا بھی اسی مقصد کا ایک اعلان تھا جس کی خاطر آخر میں آپ کو جان دینا پڑی لیکن چونکہ عقل و آئین کے حدود میں جب تک مقصد کا تحفظ جان دئے بغیر ہو سکے اس وقت تک ایسا اقدام خودکشی ہے اس لئے آپ دوسری صورتیں پیدا کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔

عمر سعد نے اس بے ضرر تجویز کا خیر مقدم کیا تھا اور اس نے ابن زیاد کو لکھا تھا کہ الحمد للہ فتنہ و فساد ختم ہو گیا۔ حسینؑ آمادہ ہیں کہ وہ جہاں سے آئیں ہیں، وہاں واپس جائیں یا ملک کو چھوڑ دیں مگر ابن زیاد جیسے آل رسولؐ سے سخت عداوت تھی بعض مفسدین کے ورغلانے سے اس پر آمادہ نہ ہوا اور اس نے اسی پر اصرار کیا کہ حسینؑ بیعت کر لیں، تب ان کی جان بچ سکتی ہے۔ یہ وہ بات تھی جسے پہلے سے حسینؑ طے کر چکے تھے کہ ناممکن ہے۔

انھیں بیعت کرنا ہوتی تو پہلے ہی دن کیوں نہ کرتے؟ اب خطرہ کو سامنے دیکھ کر وہ اس بیعت پر تیار ہو جاتے تو وہ ایک کمزور نفس اور ضمیر کے انسان ثابت ہوتے اور وہ حسینؑ نہ ہوتے کوئی اور شخص ہو سکتا تھا۔

حقیقتاً امام حسینؑ اور یزید کے درمیان جو خلیج حائل تھی وہ شخصی یا ذاتی نہ تھی اسلامی اور اجتماعی تھی۔

یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ مقابل میں بنی امیہ کا ایک شخص یزید ہی تھا نہیں وہ بنی امیہ نہ ہوتے تو کوئی اور قبیلہ ہوتا بلکہ بنی ہاشم کا ہی کوئی شخص ہوتا لیکن اگر وہ ان مقاصد کے ساتھ تصادم رکھتا ہوتا جس کے حسینؑ محافظ تھے تو آپ اس کے مقابلے میں یونہی کھڑے ہو جاتے جس طرح یزید کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے۔

امام حسین علیہ السلام کے مقاصد

ہر جنگ میں مقاصد کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ حسینؑ کے مقاصد بہت حد تک ان کے افعال سے ظاہر ہیں جن پر کسی حد تک اس کے پہلے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے اقوال جو مختلف خطبوں میں ہم تک پہنچے ہیں آپ کے مقاصد کی تشریح

کر سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ تاریخ نے ان تمام خطبوں کو محفوظ نہیں کیا جو آپ نے متعدد مواقع پر ارشاد فرمائے مگر جہاں تک محفوظ ہو سکے ہیں وہ کسی حد تک ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔

سب سے پہلے اس وقت جب ولید نے آپ کے سامنے بیعت یزید کا مطالبہ پیش کیا ہے آپ نے شروع میں دفع الوقتی سے کام لینا چاہا لیکن مروان کی مداخلت بیجا پر آپ کو غیض آ گیا آپ نے ولید کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

انا اهل بيت الرسالة و معدن النبوة و مختلف الملائكة بنا فتح الله و بنا ختم الله و يزيد رجل فاسق شارب الخمر قاتل نفس المحرمة معلن بالفسق و مثلي لا يبايع۔

''ہم اہل بیت رسالت ہیں اور معدن نبوت اور ملائکہ کی آمد کی منزل۔ کمالات انسانی کی ہم سے ابتدا اور ہم پر انتہا ہے اور یزید بدکار ہے اور شراب خوار، بے جرم و خطا خون بہانے والا اور علی الاعلان گناہوں کا ارتکاب کرنے والا اور میرا ایسا شخص اسکی بیعت نہیں کر سکتا۔''

اس میں آپ نے اپنی ذمہ داریوں کو بتلاتے ہوئے اپنے اور یزید کی حیثیت کا تفرقہ اور اختلافات کے وجوہ صاف بیان کر دئے ہیں۔ آپ کا عمل اپنے آخری نقطہ تک آپ کے اسی قول کی تفسیر ہے اور بس۔

کربلا میں عمر سعد کے جواب پر آپ نے ارشاد فرمایا:

والله لا اعطيكم يدى اعطاء الذليل ولا افر فرار العبيد۔

''خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنے کو تمہارے قبضہ میں نہ دے دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح تمہارے سامنے سے بھاگوں گا''

یہ تھا بہادری اور جانبازی کی موت کا اعلان۔ اسی کو ایک دوسری جگہ اہل شام کو مخاطب کر کے اس طرح ارشاد فرمایا:

يا عباد الله اني عذت بربي و ربكم من كل متكبر لا يومن بيوم الحساب الموت في عز خير من حيوة في ذل۔

''اے بندگان خدا میں پناہ مانگتا ہوں ایسے شخص سے جو نخوت و غرور رکھتا ہو اور روز قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو اور موت عزت کے ساتھ بہتر ہے اس زندگی سے جو ذلت کے ساتھ ہو۔''

پہلے فقرے میں جبار و سرکش یزید کے جبروت سلطنت کی تحقیر ہے اور دوسرے فقرے میں اس کی تشریح ہے کہ مادی طاقت کے آگے بلند مقاصد کے خلاف سر جھکا دینا عزت انسانی کے خلاف ہے اور اس زندگی سے جو اس طرح ہو موت بہتر ہے۔

اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا ہے کہ:

الموت اولیٰ من رکوب العار۔

''مر جانا عار و ننگ سے بہتر ہے۔''

شب عاشور کے خطبہ میں اعوان و انصار کو مخاطب کر کے فرمایا:

انی رأيت القتل في العز حيوة والعيش في الذل قتلاً۔

''میں باعزت مر جانے کو زندگی سمجھتا ہوں اور ذلت کی زندگی بسر کرنے کو موت خیال کرتا ہوں۔''

جنگ کا قطعی فیصلہ

نویں محرم کی شام تھی جب ابن زیاد کا خط عمر سعد کے پاس آیا جس نے صلح کی گفتگو کو قطعی طور پر ختم کر دیا یا بیعت اور یا قتل، اور یہ بات عمر سعد بھی جانتا تھا کہ بیعت کا کرنا امام حسینؑ کے لئے ناممکن ہے، اس لئے اس کے نزدیک اب سوائے جنگ کے کوئی دوسری صورت نہ تھی چنانچہ اس نے فوراً ہی لشکر حسینؑ پر حملہ کر دیا۔

امامؑ نے اس غیر متوقع حملہ کا کسی مضطربانہ انداز میں استقبال نہیں کیا بلکہ بہت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ آپ نے اپنے بھائی عباسؑ کو بھیج کر حملہ کا سبب دریافت کیا، اور یہ معلوم ہونے پر کہ ابن زیاد کا قطعی حکم جنگ کے لئے آ گیا ہے، آپ نے صرف ایک شب کی مہلت طلب کی۔

ناواقف لوگ اس ایک رات کی مہلت میں نفس کی کمزوری کا پہلو مضمر سمجھ سکتے ہیں مگر جس نے حسینؑ کی سیرت کا

مطالعہ کیا ہے وہ اس کا خیال بھی ناممکن سمجھتا ہے۔

اس ایک شب کی مہلت میں بڑی مصلحت یہ مضمر تھی کہ آپ خطرہ کے یقینی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنی طبیعتوں کے تول لینے کا موقع دے دیں اور ایک بار اور یہ کہہ دیں کہ جو ساتھ چھوڑ کر چلا جانا چاہے وہ جائے تاکہ عین وقت پر کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے جو خطرہ کے ہنگامی ہونے کی وجہ سے بادل نخواستہ آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوا ہو۔ چنانچہ آپ نے اس شب کو اپنے مجمع کو چھانٹنے کی کوشش کی اور لوگوں کو غور و خوض کر لینے کا پورا موقع دیا۔ اب جو لوگ حسینؑ کے ساتھ رہ گئے تھے وہ موت کو اپنے سامنے یقینی سمجھتے ہوئے دل و جان سے آمادہ تھے، اس لئے کمزوری کا ان میں شائبہ بھی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ فریق مخالف کے افراد لشکر کو بھی آپ نے ایک شب کا موقع غور و فکر اور حق و باطل کے موازنہ کے لئے دے دیا اور اسی مہلت کا نتیجہ تھا کہ عمر سعد کی فوج کا ایک بڑا افسر حر ابن یزید ریاحی جو سب سے پہلے حسینؑ کو گھیر کر کربلا میں لانے کا ذمہ دار تھا، اپنے ضمیر کی ہدایت سے الگ ہو کر فوج عمر ابن سعد سے الگ ہو کر حسینؑ کی جانب آ گیا اور آپ کی نصرت میں جان نثار کی۔

یاد رکھئے کہ ایک داعی حق کی یہ بڑی کامیابی ہے اگر وہ ایک انسان کو بھی گمراہی سے نکال کر ہدایت تک پہنچا دے، اور یاد رکھئے کہ حسینؑ کے اصول کی یہ ایک بہت بڑی فتح صرف اس شب کی مہلت کا نتیجہ تھی جو آپ نے دشمن سے مانگ کر حاصل کی تھی۔

عاشور کی صبح

رات گئی اور دسویں محرم کی صبح نمودار ہوئی۔ عمر سعد نے میدان جنگ میں اپنے صفوف لشکر کو مرتب کیا اور حسینؑ نے اپنی مختصر جماعت کی ترتیب دی اس وقت آپ نے ضرورت سمجھی کہ فریق مخالف کو اپنی بے گناہی پر آخری بار تنبیہ کر دیں، اور اس کثیر التعداد لشکر کے سامنے صورت حال کو واضح کر دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ناواقفیت میں کوئی شخص اس جرم عظیم میں مبتلا ہو اور اس کی ذمہ داری آپ پر رہے۔

آپ ایک ناقہ پر سوار ہوئے اور صفوف لشکر کے سامنے جا کر ایک فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جس میں اپنی خاندانی خصوصیات، رسولؐ اللہ کے ساتھ اپنا تعلق، اپنی اخلاقی پاکیزگی اور جرائم سے علٰیحدگی نیز رسولؐ اللہ کے احادیث جو آپ کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان قابل تسلیم تھے، ان کو ایک ایک کر کے پیش کیا اور پھر یہ دریافت کیا کہ اس صورت میں کس بنا پر میرا خون تمہارے لئے حلال ہو سکتا ہے۔

فوج کے لوگ جو اقتدار سلطنت کے غلام بنے ہوئے تھے اس سے کیا اثر لیتے مگر آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا اور دکھا دیا کہ ایک مصلح کسی وقت بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوتا۔

آغاز جنگ

سب سے پہلے عمر سعد نے ایک تیر چلۂ کمان میں جوڑا اور حسینی جماعت کی طرف لگایا، یہ کہہ کر کہ گواہ رہنا پہلا تیر میں لگاتا ہوں، اور اسی کے ساتھ ہزاروں کمانیں کڑکیں اور ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔ یہ تھا پیغام جنگ حسینؑ، اس کے لئے پہلے سے تیار تھے۔ انھوں نے اپنے بہادروں کو آواز دی کہ ہاں مجاہدو! کھڑے ہو جاؤ، دشمن کے سفیر تمہاری طرف جنگ کا پیغام لے کر آ گئے۔

معرکۂ جہاد

کیا تصویر کھینچی جا سکتی ہے اس موقع کی جب ایک طرف ہزاروں کا لشکر ہو اور دوسری طرف تھوڑے سے بھوکے پیاسے آدمی ہوں جن میں مشکل سے لڑنے کے قابل سو آدمی ہوں گے ورنہ باقی سب تو کمسن بچے تھے اور ضعیف العمر بوڑھے مگر انھوں نے اس طرح جنگ کی کہ صفحۂ تاریخ پر اس کا تذکرہ نمایاں حروف میں باقی رہ گیا۔

وہ گذر گئے مگر ان کی بہادری اور جنگ آزمائی کی یاد آج تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اصحاب کا خاتمہ

پہلے سب سے حسینؑ کے دوست اور انصارؑ جو آپ سے خاندانی تعلق نہ رکھتے تھے وہ ایک ایک کر کے میدان جہاد میں

گئے اور شہید ہوئے۔

یہ ایک حیرت انگیز نظام تھا جو اس سخت اور اضطراب انگیز موقع پر انتہائی استقلال سے قائم کیا گیا تھا۔ جب تک اصحاب میں سے ایک بھی زندہ رہا، حسینؑ کا کوئی عزیز میدان جنگ میں جانے نہ پایا اور باوجودیکہ جنگ مغلوبہ بھی ہوئی اور تیروں کی بارش بھی ہوئی، پھر بھی آپ کے کسی عزیز کو زخم تک لگنے نہ پایا۔

ہاں جب اصحابؑ ختم ہو گئے تو عزیزوں کی باری آئی۔

جوان بیٹے کی شہادت

عزیزوں میں سب سے پہلے حسینؑ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبرؑ کو میدان جنگ میں بھیجا، ان کی ماں لیلیٰ خیمہ میں تھیں اور باپ خیمہ کے دروازہ پر اور ان کا چاند دشمنوں کی فوج کی گھٹا میں چھپا تھا۔

باپ نے دیکھا اور ماں نے سن لیا کہ علی اکبرؑ تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر صبر وسکون میں فرق نہ آیا، وہ اس قربانی کے لئے پہلے سے تیار تھے وہ یہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ ان کی اسکیم کا ایک جز پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

بھانجوں بھتیجوں اور دوسرے عزیزوں کی شہادت

عقیلؑ کی اولاد جعفرؑ کی اولاد اور سب سے زیادہ حسینؑ پر مہربان بھائی حسن مجتبیٰؑ کی اولاد یکے بعد دیگرے حسینؑ سے جدا ہوتی گئی ان میں اپنے بھائی کے کمسن یتیم قاسمؑ کی جدائی حسینؑ پر بہت شاق تھی مگر مقصد کی عظمت کے سامنے یہ بھی آسان تھا، حسینؑ نے اس کو بھی گوارا کر لیا۔

علمدار کی رخصت

جب حسینؑ کے پاس کوئی لڑنے والا نہ رہا تو آپ کے بھائیوں کی باری آئی اور یہ سب شہید ہو گئے تو آخر میں آپ کے لشکر کے علمدار قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ نے اجازتِ جہاد طلب کی۔ حسینؑ کو بہت ناگوار تھا یہ کہ آپ کے لشکر کا نشان جو آپ کے جہاد کا سربلند اعلان تھا وہ جھک جائے مگر اور کوئی قربانی باقی نہ تھی، مجبوراً عباسؑ کو بھی میدان میں بھیج دیا۔

دنیا نے دیکھا جب تک عباسؑ میں جان باقی رہی علم کاندھے پر لہراتا رہا یہاں تک کہ ہاتھ قلم ہو گئے پھر بھی علم کو دونوں بازوؤں سے سنبھالا، عباس گھوڑے سے گرے، حسینؑ کا علم خاک پر آ گیا وہ جھک گیا، مگر نہیں نہیں! وہ علم اتنا سربلند ہوا کہ وہی علم ہر حق پرست کے کاندھے پر ہے۔ جب تک دنیا میں سچائی اور حق گوئی کا نشان ہے، جب تک اسلام کا نام ہے، اس وقت تک حسینیت کا علم دنیا میں بلند ہے اور ہمیشہ بلند رہے گا۔

آخری قربانی

حسینؑ کی بارگاہ میں کوئی سرمایہ حق کی بارگاہ میں نذر دینے کے لئے نہ تھا، مگر نہیں — فریق مخالف کے تشدد کا آخری تیر باقی تھا اور اس کے لئے حسینؑ کو نشانے کی تلاش تھی انھیں دنیائے انسانیت کے سامنے وہ معصوم ہدیہ پیش کرنا تھا جس پر کسی شریعت اور قانون کی رو سے جرم و گناہ کا الزام نہ آ سکتا ہو۔

ڈھونڈھ لیا، حسینؑ نے یہ آخری تحفہ بھی ڈھونڈھ لیا۔ ربابؑ کی گود میں شیر خوار بچہ پیاس سے سسکیاں لے رہا تھا۔ ضعیف باپ نے بچے کی حالت دیکھی اور خیمہ کے دروازہ پر اسے گود میں لیا، کہا جاتا ہے کہ دشمن کی فوج سے بچے کے لئے پانی مانگا۔

یہ تھا حسینؑ کا سب سے آخری ہتھیار۔

انسانیت کے ہاتھ پاؤں میں لرزہ پڑ گیا، رحم وکرم کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا جب حرملہ نے تیر چلۂ کمان میں جوڑا اور بچہ کی گردن کو نشانہ بنا لیا، بچے نے جان دے دی اور حسینؑ کے مقصد میں لازوال جان پڑ گئی۔

نمائشی انسانیت کی نقاب کا یہ آخری تار تھا جو معصوم بچے کی رگِ گردن نے شکستہ کر دیا۔

اب ہر دھندھلی نگاہ پر بھی کھل گیا کہ اس وقت کے انسانوں کی جتنی جماعت تھی وہ انسانیت سے کتنی دور تھی اور حسینؑ ایسا انسان کامل ان کے ساتھ اتحاد کامل کیسے کر سکتا تھا۔

تکمیل قربانی

حسینؑ کے پاس اب کچھ نہ تھا۔ بس اپنا وجود تھا، یہ مرحلہ

حسینؑ کے لئے پہلے ہی بہت آسان تھا، مگر انھیں تو اپنی قوت برداشت کا انتہائی مظاہرہ کرنا تھا۔

اب جب کہ کسی دوسرے کا انتظار نہ تھا تو حسینؑ تھے اور میدان جہاد۔

اُتنا کہ جس قدر انسانی طاقت کے لحاظ سے حفاظت خود اختیاری کے لئے فرض تھا۔ اتنی جنگ بھی کی، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ حسینؑ نے اس فرض کو بھی ویسا انجام دیا جیسا اتنی شکستگی اور بیکسی کے عالم میں کوئی دوسرا انجام دے نہیں سکتا، آخر ایک انسانی جسم اور فولادی تلواروں کا سیلاب۔۔۔۔۔ جسم زخموں سے چکنا چور ہوگیا، گھوڑے کی پشت پر سنبھلا نہ گیا، مجاہد زمین پر آیا، اور دشمنوں کا چاروں طرف سے ہجوم، آخر حق کا مجسمہ تلواروں کا حصہ بن گیا۔ سچائی کی گردن قلم ہوئی اور انسانیت کا سر نیزہ کی نوک پر بلند ہوگیا۔ دشمن نے وہ سب کچھ کیا جو اس کی درندگی کا آخری حصہ ہوسکتا تھا۔ اگر امام حسینؑ کو صرف اپنے راستے سے ہٹانا ہی مقصود ہوتا تو یہ مقصد آپ کے قتل سے پورا ہوگیا — مگر نہیں!

آپؑ کی لاش کو پامال کیا گیا، آپ کے اہل حرم کو در بدر پھرایا گیا، صاف معلوم ہوتا ہے کہ صرف آپ کی ہستی کو فنا کرنا مقصود نہ تھا بلکہ ایسے مرکز کو فنا کرنا اور عوام کی نظروں سے گرانا مقصود تھا جو اقتدار حاصل کرنے والی جماعت کے مقاصد سے اختلاف رکھتا تھا۔

یہ ہیں حسینؑ اور یہ ہے ان کا عظیم کارنامۂ جاوید۔ حسینؑ دنیا سے اٹھ گئے مگر وہ زندہ ہیں، ان کا مشن زندہ ہے، اور ان کی بدولت سچائی اور اسلام کا نام زندہ ہے۔

۱۳۶۱ھ میں

حسینؑ کے اس عظیم الشان کارنامۂ شہادت کو تیرہ سو برس ہوجائیں گے اور اس موقع پر آپ کی سیزدہ صد سالہ یادگار کے قیام کا انتظام ہورہا ہے۔

حسینؑ کی ذات کسی خاص قوم اور اور مذہب سے محدود تعلق نہیں رکھتی بلکہ تمام دنیائے انسانیت سے تعلق رکھتی ہے۔

دیکھنے کی بات ہے کہ وہ انسان کیسا تھا جس نے اصول کی حمایت اور سچائی کی حفاظت میں اس استقلال، انتظام، اور اطمینان کے ساتھ قربانیاں پیش کیں اور ذرا پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔

اس بنا پر تمام دنیائے انسانیت کو دعوت دی جاتی ہے کہ حسینؑ کی سیزدہ صد سالہ یادگار کے قیام میں حصہ لے کر انسانی ہمدردی کا ثبوت دیں اور اس انسانی مقصد کو تقویت پہنچائیں جس کے لئے شہید کربلاؑ نے اپنی بے نظیر قربانی پیش کی تھی۔ والسلام

علی نقی نقوی عفی عنہ

(اشاعت اوّل: محرم ۱۳۶۰ھ)

بقیہ۔۔۔۔ شہادت حسینؑ اور واقعۂ کربلا

اس حسینی للکار کو سن کر ظالم فوج یزید کے سر شرم وحیا سے جھک گئے۔ کوئی جواب نہ تھا! سوائے اس کے کہ تیروں کی بارش ہونے لگی بے رحم انسانی درندوں کی تلواریں امام کے جسم اقدس پر برسنے لگیں آخر ان تیروں، نیزوں اور تلواروں نے اپنا کام پورا کردیا اور اس بوڑھے نیلگوں آسمان نے وہ وقت! وہ قیامت خیز وقت! اور وہ انسانیت کی روح کو تڑپا دینے والا وقت! بھی دیکھ لیا جب حسینؑ مظلوم کا سر مُطہّر یزیدی فوج کے ایک طویل نیزے پر بلند تھا۔ بناتِ سیدۂ عالم سر برہنہ تھیں۔ نواسۂ رسول اللہ کی لاشِ اطہر بے گوروکفن جلتی ہوئی ریت پر پڑی تھی اور اس پر ظالم فوج اپنے گھوڑے دوڑا رہی تھی اور یہ قیامت کا منظر فرزند رسولؐ کی بہنیں اور بیٹیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

امام حسینؑ کی قربانی اور شہادتِ اسلام اور قرآن کی ابدی فتح کا نشان ہے

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

۞۞۞